ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

محمد سید علی
لیکچرار، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان
ڈاکٹر عابد خورشید
اسسٹنٹ پروفیسر، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان
شازمہ زہرا
لیکچرار، گورنمنٹ گرلز ایسوسی ایٹ کالج، چوٹی زیریں، ڈیرہ غازی خان

اُردو افسانے کی تحقیق و تنقید میں ڈاکٹر انوار احمد کا حصہ

Muhammad Said Ali
Lecturer, Ghazi University, Dera Ghazi Khan
Dr. Abid Khurshid
Asst. Prof. Ghazi University, Dera Ghazi Khan
Shazma Zahra
Lecturer, Govt. Associate College for girls Choti Zareen, D.G Khan

Urdu Afsany ki Tehqeeq o Tanqeed main Dr. Anwaar Ahmad ka hissa

Dr. Anwaar Ahmad's research and criticism about Urdu short stories is by no mean insignificant. He increases his thesis of PhD about " Urdu Afsana: Apny Siasi aur Smaji Tnazur main" in book form with the name of "Urdu Afsana: Aik Sdi ka Qissa". First of all he discusses 150 fiction's writers. In third edition he discusses 245 fiction's writers from 1903 to 2017 [almost above to one century].In this book, he has explained and divided fiction writers their behaviors, tendencies and movements inspite of chronologically. I explain in this essay the critical work of Dr. Anwaar Ahmad about Urdu short stories.

Key Words: *Narrative, Mythology, Symbol, Abstraction, Ambiguity, Postmodernism.*

ڈاکٹر انوار احمد معروف افسانہ نگار، خاکہ نویس، کالم نویس، محقق، مترجم اور نقاد ہیں۔ ۱۱/ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے تاریخی خطہ مدینتہ الاولیاء ملتان میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ مسلم ہائی سکول ملتان اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان ان کی تربیت گاہیں ٹھہریں۔ اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد ۴/ مئی ۱۹۷۱ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے تدریس کا آغاز کیا۔ پھر گورنمنٹ خواجہ فرید کالج رحیم یار خان، گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان اور وہاں سے ۱۶/ نومبر ۱۹۷۶ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اُردو سے ایسے جڑے کہ پھر اپنی ریٹائرمنٹ ۲۷/ جون ۲۰۰۷ء تک وہیں رہے۔ ہاں اس بیچ نومبر ۱۹۹۵ء تا ۳۱/ جولائی ۱۹۹۹ء تک انقرہ یونیورسٹی ترکی کا بھی بطور اردو سکالر استاد کے پھیرا لگا آئے۔

بعد از ریٹائرمنٹ یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء سے ۲۸/ فروری ۲۰۰۹ء تک جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے صدرِ شعبہ اُردو رہے۔ پھر یکم اپریل ۲۰۰۹ء سے ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء تک اوساکا یونیورسٹی جاپان میں پڑھایا۔ بعد ازاں جون ۲۰۱۱ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء تک مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے چیئر مین رہے۔ اگست ۲۰۱۳ء سے ستمبر ۲۰۱۵ء تک گجرات یونیورسٹی کے سیالکوٹ کیمپس میں ڈائریکٹر جنرل کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔[۱] گزشتہ سات سال سے نئے لکھنے والوں کا نمائندہ سہ ماہی ادبی رسالہ 'پیلوں' انھی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کی تصانیف میں "اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ"، "تحریکِ پاکستان میں اقبال کا کردار"، "خواجہ فرید کے تین رنگ"، "اردو ادب کے معمار 'شوکت صدیقی"، "یک جا"، افسانوی مجموعہ "آخری خط" اور شخصی خاکوں کا مجموعہ "یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ" اہم ہیں۔

اردو افسانے میں غیر معمولی دلچسپی اور خود افسانہ نگار ہونے کے باعث ڈاکٹر انوار احمد نے اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی اردو افسانہ پر لیا۔ اپنی کتاب "اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ" کے پیش لفظ میں اس کتاب کا اصل محرک بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بنیادی طور پر اس کا ماخذ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو افسانہ اپنے سیاسی اور سماجی تناظر میں" ہے، جس کا ایک جزو بیکن بکس ملتان نے "اردو افسانہ تحقیق و تنقید" کے عنوان سے شائع کیا، میرا خیال ہے کہ دو چار کمزوریوں کے باوجود یہ کتاب عام طور پر ایک سطح کے طالبعلموں اور اُستادوں کے لیے مفید رہی، لیکن مجھے برس ہا برس یہ خیال بھی رہا کہ اگر کبھی وقت ملا تو اس پر نظر ثانی کر کے اور تمام افسانہ نگاروں کے بارے میں تازہ ترین معلومات کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کروں گا جو اُردو افسانے کی ایک صدی کا قصہ ہو۔" [۲]

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

یوں ڈاکٹر انوار احمد نے افسانوی تحقیق و تنقید میں اپنا جو حصہ ڈالا، وہ پی ایچ ڈی کے مقالے اور بعد ازاں مختلف کتابوں کی صورت بدلتا ہوا حتمی شکل میں "اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ" کی صورت سامنے آیا۔اس تحقیقی و تنقیدی کتاب کے اب تک تین ایڈیشن (زیرِ انتظام: مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۲۰۰۷ء، مثال پبلشرز فیصل آباد،۲۰۱۰ء اور کتاب نگر ملتان،۲۰۱۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔میرے پیشِ نظر کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔پہلی دو اشاعتوں میں، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے،۱۹۰۳ء سے ۲۰۰۳ء تک کی اردو افسانہ نگاری کا صد سالہ (تحقیقی و تنقیدی) قصہ سنایا گیا ہے۔

پہلی اشاعت میں کل ایک سو باون(۱۵۲) افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا تھا۔ جبکہ دوسری بار اختر انصاری، عبدالرحمٰن چغتائی، عاصی کرنالی، وقار بن الٰہی، اعجاز راہی، ثاقبہ رحیم الدین، جاوید شاہین، رضا علی عابدی، عباس خان، شبنم شکیل، سیّد جاوید اختر، مبین مرزا، تنویر عباس نقوی، لبابہ عباس، یاسمین گورمانی، دردانہ نوشین خان اور ایاز احمد سہروردی(یعنی سترہ افسانہ نگاروں) کو نکال کر ان کی جگہ پندرہ دیگر افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا۔یوں دوسرا ایڈیشن ڈیڑھ سو(۱۵۰)افسانہ نگاروں کے ذکر تک محدود کر دیا گیا۔لیکن اب کی بار اس میں ۱۹۰۳ء سے ۲۰۱۷ء تک کے دو سو پینتالیس(۲۴۵) افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ان میں بھی اکیسویں صدی کے صرف ان افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے جن کے افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔جو افسانہ نگار ابھی رسائل میں تو لکھ رہے ہیں لیکن کوئی مجموعہ سامنے نہیں لائے، انہیں آنے والے محققین کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

کتاب کو دس حصوں میں بانٹا گیا ہے۔پہلے حصے میں "قصہ اس کتاب کا" کے عنوان سے پیش لفظ دیا گیا ہے۔اس کے ساتھ "قصے کا فن" میں افسانے کے فن پر بات کرتے ہوئے سوال اٹھایا گیا ہے کہ 'مختصر افسانہ ہے کیا؟'۔اس ضمن میں نامور مغربی و مشرقی ناقدین اور ادباء کی آراء پیش کی گئی ہیں۔ مختصر افسانے کی تکنیک اور ہیئت پہ بات کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ عہدِ جدید کی نثر میں ناول کے مقابلے میں مختصر کہانی ہوتی ہے۔ جس میں تاثر کی مرکزیت، احساس کی شدت اور حسنِ ایجاز پایا جاتا ہے۔ناقدین کا یہ بھی ماننا ہے کہ افسانے کا اختتام انکشاف پر ہوتا ہے اور معمولی واقعہ کو بیانیہ غیر معمولی بنا دیتا ہے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ان تعریفوں (جو انوار احمد اپنی اس تحقیقی کتاب میں زیرِ بحث لائے ہیں) کے علاوہ بھی دیگر ناقدین اور فکشن رائٹرز نے افسانے کی خصوصیات طے کی ہیں۔ اس سوال کے جواب میں کہ 'کہانی کب سے ہے؟' جہاں انتظار حسین نے اسے آگ کی دریافت کے فوراً بعد کی ایجاد کہا[۳]، وہاں ڈاکٹر سلیم اختر کا ماننا ہے:

"کہانی کا سفر بے حد طویل ہے اتنا ہی جتنا خود انسان کا، اس دھرتی کا، اس کی تہذیب کا، اس کے مذہب کا اور اس کے ادب کا!" (۴)

پھر یہ کہانی قصہ، داستان، ناول، ناولٹ اور آخر افسانہ، افسانچہ تک اپنی شکلیں بدلتی رہی۔ ایڈگر ایلن پو افسانے کی تعریف میں کہتے ہیں:

"یہ من گھڑت نثر کا ایسا ٹکڑا ہے، جو ایک نشست میں پڑھ لیا جائے۔" (۵)

اس کے جواب میں ڈاکٹر صفات احمد علوی لکھتے ہیں:

"ضروری نہیں کہ فکشن صرف من گھڑت باتوں یا واقعات پر ہی مبنی ہو۔ بلکہ اکثر و بیشتر اس میں زندگی سے متعلق سچے واقعات، حادثاتِ زندگی، تاریخی مواد وغیرہ کو افسانوی رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے۔۔۔ بہ الفاظِ دیگر فکشن انسانی تہذیب کا حامل ہوتا ہے۔ ان کے تہذیبی باقیات (archaeology) کو بہم پہنچاتا ہے اور انسانی معاشرے کے آنے والے دنوں کا لائحہ عمل ترتیب دینے میں سنگِ میل کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔"(۶)

ڈاکٹر وزیر آغا افسانہ نگار کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کہانی کہنے والے کی خوبی اس بات میں ہے کہ وہ کہانی کی بکھری ہوئی کڑیوں کے درمیانی فاصلے کو ختم کر کے ان کو یوں ملائے کہ سارے خدوخال ایک ترشے ہوئے واقعہ کی صورت میں مرتب ہو جائیں۔" (۷)

ہمارے ہاں عموماً یہ رویہ اپنایا جاتا ہے کہ ایک چیز کی عظمت بیان کرنے کے چکر میں دوسری چیز کی عزت گھٹا دی جاتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شاعری کی عظمت ثابت کرنے کے لیے افسانہ کو معمولی بنا ڈالا۔ لکھتے ہیں:

"افسانہ ایک معمولی صنفِ سخن ہے اور علی الخصوص شاعری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔"(۸)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

اس کے مقابلے میں راجندر سنگھ بیدی کا ماننا ہے:

"افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔" (۹)

اس طرح افسانہ کسے کہتے ہیں؟ یہ کتنا اہم ہے؟ ایک افسانہ کن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے؟ شاہکار افسانہ کیونکر لکھا جائے؟ جیسے سوالوں کے جواب قریباً ہر دوسرے نقاد اور افسانہ نگار نے الگ دیے ہیں۔ اس سب کے مقابلے میں اور ایسی باتوں کے جواب میں ڈاکٹر انوار احمد کا کہنا ہے کہ افسانے کے اچھا ہونے، اس کی ساخت اور تاثر کے لیے درحقیقت کوئی خاص تعریف یا پیمانہ طے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کی کسوٹی خود عہد کا بڑا کہانی کار ہوتا ہے۔ جو اپنے انوٹھے انداز سے اسے رواج اور سند عطا کرتا ہے۔ کہانی کے حوالے سے ایک قیمتی نکتہ دیتے ہیں:

"کہانی وقوع پذیر ہی ہوتی ہے، ایک مرتبہ سماج میں اور دوسری مرتبہ کہانی کہنے والے کے اندر، اور کبھی یہ ترتیب اُلٹ بھی جاتی ہے۔" (۱۰)

'اردو قصے کی کہانی' سناتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد نے داستان اور ناول کی سمٹتی مگر بلیغ صورت افسانے کی تخلیق میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، انگریزوں کے جبر، دو قومی نظریہ، فسادات، بے بسی، غلامی، اسلامی اور عالمی سیاست، جہالت اور مولویت کو پس منظر کے طور پر دکھایا/ بتایا ہے۔ افسانوی مجموعے 'انگارے'، 'آتش پارے'، 'شعلے'، 'الاؤ' اور 'چنگاریاں' اپنے نام کی طرح آگ و خون کا دردناک قصہ اپنے اپنے انداز میں سناتے نظر آتے ہیں۔ صرف جلیانوالہ باغ کے سانحہ ۱۹۱۹ء پر راشد الخیری، منٹو، غلام عباس اور دیگر بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔ مغرب کے نو آبادیاتی نظام) استعماریت (Colonialism/ کے خلاف مزاحمت تقسیمِ ہند اور اس کے نتیجے میں ہونے والے ہجرت و فسادات کے سانحہ میں ڈھل گئی۔

تقسیم کے بعد کے افسانے میں جہاں مخالف قوموں کے ظلم کے خلاف جذباتیت، مہاجر کیمپوں میں خود اپنوں کی طرف سے ڈھائے گئے مظالم اور انسانیت کی اس ارزانی کے مقابلے میں انسان دوستی کی بات کی گئی وہاں یاسیت کے مقابلے میں رجائیت بھی کہانی کا حصہ بنی۔ بعد ازاں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور سقوطِ مشرقی پاکستان (۱۹۷۱ء) کا المیہ بھی افسانے کا موضوع بنا۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

پاکستان میں سرمایہ اور حقوق کی غیر منصفانہ تقسیم نے ترقی پسندوں سے حقیقت آمیز کہانی لکھوائی تو حلقہ اربابِ ذوق اور جدیدیت کے علمبرداروں نے اساطیری و علامتی کہانیاں لکھیں۔ اب چند عشروں سے ہمارے وہ پاکستانی جو ملک کو دارالحرب جان کر یا بہت سے معاشی و معاشرتی اسباب کے پیشِ نظر مغربی ممالک کی طرف سدھار چکے ہیں یورپ، امریکہ سے پاکستانی عوام کی نمائندگی میں افسانہ لکھ رہے ہیں۔ اب افسانہ بھی حقیقت، رومان، علامت، تجریدیت، ماڈرن، پوسٹ ماڈرن اور مابعد مابعد جدیدیت تک آ پہنچا ہے۔ یوں اُردو افسانے کی یہ دلچسپ اور آوارہ کہانی راشد الخیری، یلدرم، پریم چند، منٹو، غلام عباس وغیرہ سے ہوتی ہوئی انتظار حسین اور نیر مسعود کے وسیلے سے آگے بڑھی ہے۔ اردو افسانے کی اس سو سالہ زندگی سے متعلق لکھتے ہیں:

> "اس مختصر سی عمر میں اردو افسانے نے کیا نہیں دیکھا، آشوبِ زیست کا کونسا ضائقہ نہیں چکھا اور جبر و استحصال کے کونسے حربے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ اس لیے میرے خیال میں مختصر افسانہ ادب کی تمام اصناف پر اس لیے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں ہماری قومی تاریخ کی ایک دستاویز بننے کی اہلیت بھی ہے اور فنی رچاؤ کے وہ تمام انداز بھی جو کسی صنفِ ادب کو قلیل المیعاد بننے سے بچا لیتے ہیں۔" (۱۱)

دوسرے حصے میں ڈاکٹر انوار احمد نے "اردو میں پہلے افسانہ نگار کا مسئلہ" کو اٹھایا ہے اور اس سلسلے میں سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور علامہ راشد الخیری کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن مارچ ۱۹۷۱ء میں لکھی گئی اپنی کتاب "مطالعہ یلدرم" میں سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر انوار احمد کا یہ مؤقف ہے کہ یلدرم کے بیشتر افسانے ترکی اور انگریزی سے ملخص، آزاد یا نیم آزاد تراجم ہیں۔ یہاں تک کہ یلدرم کے جس افسانے 'نشے کی پہلی ترنگ' کو اردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ قرار دیا گیا وہ بھی ترکی کہانی کار خلیل رشدی کی کہانی کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' بھی انگریزی کے ایک مضمون کا چربہ ہے۔ ہاں یلدرم کی اہمیت رومانوی تحریک کے نمائندہ قلم کار کی ضرور ہے۔

سیّد وقار عظیم 'سلطان حیدر جوش' کو اردو کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ لیکن سلطان حیدر جوش کی بھی کوئی تحریر مخزن کی جلد ۱۴، شمارہ ۳، دسمبر ۱۹۰۷ء سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔ جبکہ علامہ راشد الخیری کا افسانہ "نصیر اور

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

خدیجہ" اس سے چار سال پہلے مخزن کی جلد ۶، شمارہ ۳، دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہو چکا تھا۔یوں ڈاکٹر انوار احمد 'راشد الخیری' کو اردو کا اوّلین افسانہ نگار جانتے ہیں۔اس زمانے کی دیگر تحریروں سے متعلق لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے اردو جرائد میں تمثیلی مضامین، طنزیہ مضامین اور انشائے لطیف کے طور پر بہت سی تحریریں شائع ہوئیں جو کسی بھی دریادل نقاد کو افسانہ دکھائی دے سکتی ہیں۔" (۱۲)

مندرجہ بالا بیان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ڈاکٹر انوار احمد نے راشد الخیری کی تحریر 'نصیر اور خدیجہ' (جسے انہوں نے سر عبدالقادر کی لائبریری میں موجود مخزن کے ابتدائی برسوں کے فائل دسمبر ۱۹۰۳ء میں دیکھا) کو افسانہ تسلیم کر لیا اور اسے اردو کا پہلا افسانہ قرار دے دیا ہے۔(راقم الحروف نے بھی 'روشنائی' کے افسانہ صدی نمبر میں مرزا حامد بیگ کی تحقیق کے حوالے سے یہ افسانہ پڑھا ہے) اگرچہ 'نصیر اور خدیجہ' مکمل طور پر افسانہ نہیں یا اگر رعایت سے کہا جائے تو ابھی گھٹنیوں چل رہا ہے۔میں اسے صرف اس لیے افسانہ مان رہا ہوں کہ ابتدائے عشق ہے۔اور یوں بھی اس سے پہلے نیاز فتح پوری کے "مولانا وارث علی اور ان کی بیوی"، "خواجہ مسرور شاہ نظامی اور صفیہ" جیسے افسانے اسی طرح خط کی تکنیک پر ملتے ہیں۔

دلی سے بڑی بہن 'خدیجہ' بھائی 'نصیر' (جو ملتان یا لاہور میں اسّی روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے) کو خط کے ذریعے گھر کے حالات سے آگاہ کرتی ہے کہ کس طرح بڑے بھائی تنگ دست اور وہ خود بے حال ہے۔بہن 'صادقہ' کی اچانک موت کے بعد اس کے بچوں کو نانی نے پالا تھا۔مگر اب جبکہ وہ بھی نہ رہیں تو دونوں یتیم بچے پھٹے حال اور بے یار و مددگار ہیں۔خدیجہ نصیر کو لعن طعن اور نصیحت و محبت کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ صادقہ کے بچوں (اپنے بھانجوں) کی کفالت کا ذمہ لے۔افسانے میں محاورے اور روز مرہ سے بات میں حسن پیدا کیا گیا ہے:

> "جو کہیں خدانخواستہ تمھارے در پر آکر پڑتی تو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلوا دیتے۔۔۔ ابّا کا حج کو جانا اونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔۔۔ بال بچوں کا ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے دنیا جہان میں ہوتی آئی ہے۔مگر یہ اندھیر کہیں نہیں دیکھا کہ الگ گھر کرتے ہی سب کو دھتا بتائی۔اماں کا مرنا ہماری تو مٹی پلید ہوئی مگر تم کو عید ہو گئی۔۔۔ غدر سے پہلے اس مکان پر ہاتھی جھولتا تھا۔۔۔ مٹکے میں آٹا برکت، بقچی میں کپڑے اللہ کا نام" (۱۳)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

خدیجہ، بہن صادقہ کے بچوں کی حالتِ زار بیان کرتی ہے:

> "غلاموں کی بھی حالت اچھی ہو گی جیسی ان بچوں کی تھی۔ پھٹا ہوا کرتہ، ٹوٹی ہوئی جوتی، پاجامہ چکّٹ، ٹوپی چوہا، بدن پر سیروں میل، آنکھوں میں الغاروں چپڑ، ان بچوں کو دیکھ کر مجھ کو وہ دن یاد آ گیا کہ جب تک دونوں کی الٹالقین نہ آ گئیں۔ صادقہ رابعہ کی چوتھی میں نہ گئی۔ دیکھ لو تین چار ہی برس کے اندر اندر کیا کیا ہو گیا۔" (۱۴)

ڈائیلاگ کی مدد سے راشد الخیری نے خدیجہ اور اس کے عزیز رشتہ داروں کے تقریباً تمام حالات کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور یہ سب خط کی تکنیک کے خوبصورت استعمال سے ممکن ہوا ہے۔ اگرچہ بھائی کو وہ باتیں بھی بتانا، جو اسے پہلے سے پتا تھیں، افسانے کا عیب بن جاتا۔ لیکن خط کے مضمون کو تاکید کی زبان عطا کر کے راشد الخیری نے اس عیب سے بھی کافی حد تک خلاصی پالی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد نے پہلے افسانہ نگار کا مسئلہ سلجھانے کے بعد راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش کا بالترتیب بطور افسانہ نگار تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

تیسرے حصے میں پریم چند اور اس کی روایت کا بیان ہے۔ جس میں پریم چند کے معاصرین و مقلدین سدرشن، اوپندر ناتھ اشک، علی عباس حسینی، اختر اورینوی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، ہنس راج رہبر، اختر انصاری اور کشمیری لال ذاکر جیسے افسانہ نگاروں کو رکھا گیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں مثالیت، رومانیت، جذباتیت اور ان سے بڑھ کر سماجی واقعیت نگاری پائی جاتی ہے۔ پریم چند چونکہ خود ترقی پسند اور انسان دوست فکر رکھتے تھے اس لیے ان سے متاثر ہونے والے اور اس خاص رنگ میں لکھنے والے بھی اس کے اثر سے بچ نہیں پائے۔ پریم چند نے ہندوستانی دیہاتوں اور اس کے مظلوم طبقوں کے حق میں قلمی جہاد کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد کے مطابق پریم چند فقط اوّلین افسانہ نگاروں میں سے ہونے کی وجہ سے ممتاز نہیں ہوئے۔ بلکہ

> "پریم چند کا ماجرا محض اوّلیت کا نہیں، اس نے ایک دیہاتی مدرس کے طور پر ہندوستان کے بڑے طبقے کی روح اور ثقافت کو ہی نہیں سمجھا بلکہ سماج کے حقیقی مسائل، تضادات کا بھی بغور جائزہ لیا اور اکثر ان مسائل کو تقدیر بنانے والے ظالم کی نشاندہی جرأت کے ساتھ کی۔" (۱۵)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

یہ پریم چند ہی تھے جنھوں نے اردو افسانے کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

چوتھے حصے میں سجاد ظہیر اور انگارے کے دیگر باغیوں کے ساتھ ساتھ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی اور ابراہیم جلیس سمیت پچیس (۲۵) ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کے حق میں اور امیروں، سازشیوں، جاہلوں، ظالموں اور سامراج کے خلاف کہانیاں لکھیں۔ مگر جس طرح ترقی پسندوں نے اپنی دانست میں غیر ترقی پسند فکر رکھنے والوں کو راندۂ درگاہ کیا اسی طرح انتظار حسین جیسے بہت سے جدید افسانہ نگاروں، رجعت پسندوں، حلقہ اربابِ ذوق اور جدیدیت کے علمبرداروں نے بھی ترقی پسند تحریک کے ذم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تو ترقی پسندوں کے افسانے کو محض مقصدیت ہی کے کھاتے میں ڈال دیا۔

> "ترقی پسندوں نے افسانے کو اس لیے فروغ دیا کہ ادب سے جس قسم کا کام وہ لینا چاہتے تھے اس کے لیے افسانہ موزوں ترین صنف تھا۔ ورنہ انہیں افسانے سے کوئی محبت نہ تھی۔" (۱۶)

فاروقی صاحب کا دعویٰ کچھ حد تک تو سچ ہے لیکن اسے کلی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ پھر منٹو اور اس سے بھی پہلے بیدی اور بالخصوص کرشن چندر کے بہت سے افسانے سوال بن جائیں گے۔ جن میں مقصدیت سے الگ ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ کرشن چندر کے بہت سے افسانے تو مزدور پروری اور ترقی پسندی کے نعرے پر پورے ہی نہیں اترتے۔ وہ غربت، استحصال، جہالت اور محلاتی سازشوں کے خلاف لکھنے والے ترقی پسندوں کے مقابلے میں میٹھے خواب دیکھنے اور دکھانے والا منفرد ترقی پسند افسانہ نگار ہے۔ کرشن چندر اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ہاں اس نے ترقی پسند فکر کو بھی کہانیوں میں جگہ دی۔ انوار احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "کرشن ایک بہت بڑے انسان دوست، خواب پرست اور مطالعہ و مشاہدہ کی غیر معمولی صلاحیت کے سبب اور باوجود متخیلہ سے کام لینے کا ڈھنگ جاننے والے، ایسے افسانہ نگار تھے، جن کی مقبولیت نے جنوبی ایشیاء کے اردو دان طبقے کے جذبہ و احساس کی ایسی تربیت کی کہ جہالت، تعصب اور نفرت کی آگ میں دہکتے اس خطے میں آج بھی پریم چند، منٹو، ندیم، بیدی اور کرشن چندر کی تخلیقی پھوار اور انکے قارئین کی یہی تربیت بنیادی انسانی اقدار کی حفاظت کر سکتی ہے۔" (۱۷)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

یہ اور بات ہے کہ ندیم افسانہ نگار سے زیادہ شاعر تھے۔اس لیے ان کے اٹھارہ افسانوی مجموعوں کو وہ پذیرائی نہ مل پائی جس کے وہ حقدار تھے۔اس قرض کو چکاتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد نے دیگر تمام افسانہ نگاروں کے مقابلے میں احمد ندیم قاسمی کو سب سے زیادہ(اڑتیس۳۸) صفحات دیے ہیں۔

ترقی پسند خواتین افسانہ نگاروں میں جہاں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں کڑواہٹ، جھنجھلاہٹ، رقت، جذباتیت، توازن اور تحمل کی ملی جلی فضا پائی جاتی ہے وہاں رشید جہاں سے بھی آگے بڑھ جانے والی منٹو کی قلمی ہمزاد

> "عصمت، استحصالیوں کے لئے ایک 'ڈائن' بن جاتی ہے،جو اپنے تیز نوکیلے ناخنوں اور دانتوں سے انہیں ڈراتی ہے۔ مگر اسی لمحے مظلوموں اور مفلسوں کو وہ ایسی ماں دکھائی دیتی ہے جو انہیں لوریاں نہیں سناتی، بلکہ دھموکے لگاتی ہے اور کوسنے دیتی ہے کہ نامرد!بدبختو! غلامی، جہالت، غربت اور ظلم کے اندھیرے کا منہ کیوں نہیں نوچتے؟" (۱۸)

لیکن جہاں ترقی پسندوں نے انسانی استحصال، نسلی تعصب، فرقہ پرستی، مادہ پرستی اور رجعت پسندی کی مخالفت کی وہاں انہوں نے فحش نویسوں اور اپنی دانست میں ترقی پسندی کے نقطہ نظر کے مخالفین کو بھی تنظیم سے خارج کر دیا۔ان میں سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، اختر حسین رائے پوری،عزیز احمد، محمد دین تاثیر اور ممتاز شیریں جیسے ناقدین و ادباء شامل تھے۔اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے بانی ارکان بھی آپسی مقابلے پر جٹ گئے۔اس کم نصیبی نے ترقی پسند تحریک کا گلہ گھونٹ ڈالا۔البتہ عتاب،ماریں اور جیلیں دیکھ لینے کے بعد اپریل ۱۹۸۶ء کراچی میں اس تحریک نے دوبارہ زندگی پالی۔شاخ سے ٹوٹنے یا توڑ دیے جانے والے ترقی پسند دوبارہ آن جڑے ہیں۔جبکہ ان میں سے بیشتر اب بھی بے کھونٹ گھوم گھام رہے ہیں۔

ایہام سے سادہ گوئی کی تحریک ہو یا حقیقت نگاری کی سر سیّد تحریک،ترقی پسند تحریک ہو یا رومان و جدیدیت کی تحریکیں سبھی نے ادب کی نشوونما میں اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے اور اس کی آبیاری کی ہے۔ان تحریکوں نے ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کو بھی متاثر کیا۔

> "تحریکات، رجحانات اور رویے زندگی کا لازم ہیں۔ان سے جہاں ایک طرف زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے، جمود ٹوٹتا ہے اور یک رنگی کی فضا ختم ہوتی ہے، وہاں نئے نئے رنگوں کی نمود

ہوتی ہے، نئی معنویت اور نئی صداقتیں فروغ پاتی ہیں اور نئے نظریات و افکار کا راستہ کھل جاتا ہے۔" (۱۹)

اس لیے ڈاکٹر انوار احمد نے اپنی تحقیق و تنقید میں ان تحریکوں اور ادبی رجحانات کو ملحوظ رکھا ہے کہ جن کے زیرِ اثر شاعری اور فکشن میں نت نئی تبدیلیاں آئیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہی رومانوی تحریک کلاسیکیت اور سر سیّد تحریک کے ردِ عمل میں سامنے آتی ہے۔ اس کے روحِ رواں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری جیسے افسانہ نگار تھے۔ رومانوی افسانہ دراصل مہم جوئی سے نئی دنیا کی تلاش، روایت سے بغاوت، جذباتیت، عشق و محبت، اجتماعیت کے مقابلے میں انفرادیت، تخیل کی آزادی، فلسفہ کی آمیزش، طویل بوجھل مکالمے اور پر شکوہ زبان لیے ہوئے ہے۔ پانچویں حصے میں حجاب امتیاز علی، میرزا ادیب، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، سیّد عابد علی عابد، اے حمید، شفیق الرحمٰن اور غلام الثقلین نقوی سمیت پچیس (۵۲) رومانوی افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد رومانوی تحریک کی تقلید مخالف روش پر لکھتے ہیں:

> "ابوالکلام آزاد نے الہامی قصے لکھے اور آسمانی کتابوں سے اپنے قصص کو بنیاد فراہم کی۔ جبکہ نیاز کی شہاب کی سرگزشت اور شاعر کا انجام میں عقائد کے مابعد الطبیعاتی نظام کو تشکیک کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح مہدی افادی، مجنوں گورکھپوری، سجاد انصاری اور سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں کو پیشِ نظر رکھیں تو ایسے ہر سوال کا جواب دینا آسان ہو جاتا ہے۔" (۲۰)

لمبی لمبی کہانیاں لکھنے والا قلم کا مزدور اے حمید بھی اگرچہ رومانوی افسانہ نگار تھا اس کے کئی افسانے عشق و عاشقی اور جنس کے جذبے سے سرشار ہیں۔ لیکن اے حمید نے بنیادی انسانی قدروں کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ کیونکہ اس غریب افسانہ نگار کو محبت کے سوا اور بھی کئی صدمے لاحق تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت کنبے کے بہت سے افراد کی ہلاکت نے اس میں دردمندی اور انسان دوستی کو بڑھا دیا۔ چنانچہ

> "اے حمید کے افسانوں کے کردار محض محبت اور جنس کے کھیل میں ہی مگن نہیں ملتے بلکہ بعض کردار اپنی ذاتی مسرت کے خول سے باہر آ کر اجتماعی دکھ سکھ میں شریک ہوتے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہیں۔ چنانچہ 'گولڈ فلیک اور بیڑی' کا مرکزی کردار کسان تحریک سے وابستہ ہو کر پھانسی پر چڑھ جاتا ہے۔ 'گنتی کے افراد کی ذاتی مسرتوں کا گلا گھونٹ کر، وہ دنیا جہان کے پسماندہ، مفلس اور بدنصیب لوگوں کی لٹی ہوئی چھنی ہوئی، گمشدہ خوشیوں کی ٹوہ میں نکلا ہے۔ انفرادیت کے سرد و تاریک غاروں سے نکل کر ہمہ گیر انسانیت اور محبت کے کھلے اور وسیع میدانوں میں آ گیا ہے۔" (۲۱)

سعادت حسن منٹو بلاشبہ اُردو افسانہ نگاری میں ایک قد آور شخصیت اور trend setter ہے۔ اس کے رنگ میں رحمان مذنب اور اوپندر ناتھ اشک جیسے بہت سوں نے لکھنے کی کوشش کی اور انھیں منٹو سے بڑا منوانے پر بھی کچھ نقادوں نے بڑا زور لگایا۔ مگر لفظوں کی کاٹ اور بے باکی کے ساتھ وہ تیکھی نظر نہ پا سکے جو منٹو کا خاصہ تھا۔ عینک کے برفیلے شیشوں سے جھانکتی اور معاشرے کی اصل کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے والی نظریں، سماج کی دھتکاری ہوئی عورت 'طوائف' کے حق میں آواز اٹھانا، اس کی جوانی کے مقابلے میں بڑھاپے کے مصائب بیان کرنا، مقدمہ بازی اور تاخ تڑاخ ہر کسی سے کہاں اُٹھتا ہے۔

ہمارا معاشرہ طوائف کو 'امراؤ جان ادا' کی صورت میں پھر بھی جیسے تیسے قبول کر لیتا ہے۔ لیکن سوگندھی، سلطانہ، شاردا اور ان سے کہیں آگے ممی اور شوبھا بائی کی صورت میں ہر گز قبول نہیں کرتا۔ کتاب کا چھٹا حصہ منٹو اور اس کی روایت میں لکھنے والے رحمان مذنب، واجدہ تبسم، احمد داؤد، نیلم احمد بشیر اور عابد میر کے حوالے سے باندھا گیا ہے۔

"دھواں'، 'پھاہا' اور 'بلاؤز' منٹو کے بدنام ترین افسانے ہیں۔ منٹو کے طرفدار (حسن عسکری، ممتاز شیریں، وارث علوی) اصرار کرتے ہیں کہ ان افسانوں میں زندگی اور انسانی فطرت کی تہیں کھلتی ہیں اور ترقی پسند ناقدین منٹو کے انہی افسانوں کو رجعت پسندانہ، فحش اور خود لذتی کے شکار افسانے قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ افسانے جنسی نفسیات کے شعور کے مظہر ہیں۔ (۲۲)

ترقی پسندوں نے چند مصلحتوں کے تحت بھلے ہی منٹو کو اپنی صف سے نکال باہر کیا۔ لیکن سب جانتے تھے کہ وہ پکے ترقی پسند ہیں اور خود منٹو کو بھی اس کا مکمل شعور تھا۔ افسانہ "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" میں جب لڑکا گاؤں

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

والوں کو سمجھاتا ہے کہ محکمہ جنگلات کا افسر جھوٹا ہے۔ شیر کے دانت نہیں ٹوٹے اور نہ ہی وہ شکار سے تائب ہوا ہے۔ اس بار واقعی شیر آئے گا اور تم سب کو شکار بنالے گا۔ تو گاؤں والے اسے جھوٹا کہتے ہیں اور خوب ملامت کا نشانہ بناتے ہیں:

> "تم سازشی ہو، ففتھ کالمسٹ ہو، کمیونسٹ ہو، غدار ہو، ترقی پسند ہو ----- سعادت حسن منٹو ہو۔" (۲۳)

خواہ وہ ترقی پسند ہوں، رجعت پسند ہوں کہ اربابِ اختیار، منٹو اس 'پھیلتی بھیڑ کے اندھے اوندھے کٹوروں کی طغیانی میں' وہ باغی تھا جو اپنی اور زمانے کی گندگی کو چھپانے کا سخت مخالف تھا۔ افسانے میں ڈرامائیت، چونکا دینے کی خواہش اور غیر متوقع انجام یہی منٹو کا خاص اسٹائل تھا۔ ناقدین نے اسے موپساں اور اوہنری کے اثرات کا کرشمہ بتایا۔ اس کے جواب میں انوار احمد لکھتے ہیں:

> "منٹو کا بنیادی وصف طنز ہے۔ اس کا جتنا مؤثر استعمال منٹو نے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ دوسری بات یہ کہ منٹو کو غیر معمولی کرداروں اور غیر معمولی واقعات سے دلچسپی تھی۔ سنسنی خیزی اور چونکا دینے کی آرزو اسی سے منسلک تھی۔" (۲۴)

ساتواں حصہ 'ایک ایک یادگار افسانے کے خالق' شیورانی، قاضی عبد الغفار، جاویدہ جعفری، رضیہ سجاد ظہیر، سیّد خلیل احمد اور سیّد جاوید اختر کے نام کیا گیا ہے۔ جبکہ آٹھویں حصے 'روایت کا حاصل' کو مزید ذیلی حصوں الف اور ب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ الف میں غلام عباس، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، نیر مسعود، اشفاق احمد، عبد اللہ حسین، منشایاد اور عرش صدیقی سمیت ان سینتیس (۳۷) بڑے افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جو اَب (۲۰۱۷ء) تک اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جبکہ حصہ 'ب' میں ان بڑے تخلیق کاروں کو شامل کیا گیا ہے کہ جو ۲۰۱۷ء تک حیات تھے (مگر ان میں سے پہلے دو عدم سدھار چکے ہیں)۔ ان میں رشید امجد، مسعود اشعر، اسد محمد خاں، حسن منظر، مستنصر حسین تارڑ، صباحت مشتاق اور منزہ احتشام گوندل سمیت ساٹھ (۶۰) افسانہ نگار شامل ہیں۔

غلام عباس کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے خود کو باقاعدہ طور پر کسی بھی ادبی تحریک، رویے اور گروہ سے نہیں جوڑا تھا اور نہ ہی سستی شہرت کمانے کا کوئی ہتھکنڈا اپنایا تھا۔ لیکن

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

'آنندی'، 'اوور کوٹ'، 'کتبہ'، 'فینسی ہیئر کٹنگ سیلون' اور 'جوار بھاٹا' جیسے افسانے انہیں سچا ترقی پسند ثابت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان افسانوں میں ریاکاری، نسلی برتری، استحصال اور سطحیت کے خلاف اور مظلوم کے حق میں آواز بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے اسٹائل کو

> ''زہر خند' کا نام نہیں دیا جاسکتا کہ یہ منٹو کے ساتھ مخصوص تھا... 'اوور کوٹ' اور 'بہروپیا' میں کرداروں سے نفرت نہیں دلائی گئی بلکہ یہ ملال انگیز احساس ابھرتا ہے کہ ایک کو سماجی دباؤ نے اور دوسرے کو پیٹ کی مجبوری نے اپنا اصل روپ چھپانے پر مجبور کیا۔ مگر یہ رویہ 'آنندی' میں نہیں ہے۔ یہاں سماج کے اجارہ داروں کی ریاکاری اور سطحیت نے غلام عباس کو طنزیہ اسلوب اپنانے پر مجبور کیا ہے مگر ایسا طنز جو شور شرابہ لیے ہوئے نہیں، بتدریج لیکن گہرائی تک منافقت کے سینے میں اتر جانے والا طنز۔'' (۲۵)

ہجرت، بلاشبہ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ اور اردو ادب بالخصوص فکشن میں یہ ایک بڑا تخلیقی تجربہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر انوار احمد کے مطابق انتظار حسین اس بڑے تخلیقی تجربے کے سچے امانتدار ہیں کہ وہ خود اس اذیت سے گزرے ہیں۔ ناقدین بھلے ہی اسے ناسٹلجیا یا کوئی مرض بتائیں لیکن یہ امر فطری تھا۔ ہجرت کا کرب، روایات و رسومات اور تہذیب سے بچھڑنے کی اذیت، بستی کے گلی کوچے، اباؤ اجداد اور اپنوں کی یاد، ان کھوئے ہوؤں کی جستجو انتظار حسین کے ناولوں اور افسانوں میں جابجا ملتی ہے۔

> ''گلی کوچے' کے افسانوں کے سارے کردار حزن و ملال یا سوگ کی حالت میں ہیں۔ وہ اکھڑے ہوئے، جڑوں سے محروم، معاشرت کے نظام نسبتی کی کشش سے آزاد، آنکھوں میں تعبیر کی کرچیاں لئے مانوس سے نامانوس اور معلوم سے نامعلوم کی طرف نہیں بلکہ اجنبی سے آشنا کی طرف سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ سفر بھی پسپائی، تأسف، پچھتاوے، شک اور خوف کی بدولت دکھ اور اسرار کی اذیت سے مل کر سیدھی سادی واپسی کا سفر نہیں رہتا۔ اس موضوع پہ انتظار حسین کا شاہکار افسانہ 'بن لکھی رزمیہ' ہے۔۔۔ 'قیوما کی دوکان'، 'خریدو حلوا بیسن کا'، 'چوک'، 'اجودھیا'، 'رہ گیا شوقِ منزلِ مقصود'، 'فجا کی آپ بیتی' اور 'استاد' میں اسی ایک داستان کے ورق بکھرے ہوئے ہیں۔'' (۲۶)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

'روایت کا حاصل' کے عنوان سے قائم کردہ دوسرا حصہ موجودہ زمانے کے ساٹھ(۶۰) بڑے افسانہ نگاروں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر تخلیق کار بیانیہ سے زیادہ کے حقدار نہ تھے۔ لیکن یہ ایک صدی کے تقریباً تمام قابلِ ذکر افسانہ نگاروں کا قصہ ہے۔ اس لیے ڈاکٹر انوار احمد نقادوں سے بچنے کا جواز اور اس حوالے سے بہت سی گنجائش پا لیتے ہیں۔ ورنہ اس نسبت سے تو اگلے جہان سدھار جانے والے اور اس سے پہلے روایتوں کے ذیل میں آنے والے افسانہ نگار بھی راندۂ فہرست ہو جاتے۔

اسد محمد خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ مختلف علاقوں سے مزدوری کی غرض سے کراچی آئے مزدوروں کی زبان اور احساس کو سمجھنے والا، غریبوں کی مفلسی اور حالاتِ زندگی کا گہرا مشاہدہ رکھنے والا افسانہ نگار ہے۔ اسد محمد خاں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے لاپتا ہو جانے والے بلوچوں کے حق میں لکھا۔ بلاشبہ وہ کہنے کا بہترین ڈھنگ جانتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے پریم چند کے 'قزاقی'، منٹو کے 'بابو گوپی ناتھ'، بیدی کے 'دودھ کی قیمت' اور کرشن چندر کے 'کالو بھنگی' کی طرح کرداری افسانے بھی لکھے ہیں۔ اسد محمد خاں کے پہلے مجموعے 'کھڑکی بھر آسمان' کا ذکر کرتے ہیں:

> "اس مجموعے میں شامل 'باسودے کی مریم'، 'مئی دادا' اور 'ترلوچن' ایسے افسانے تھے جنہوں نے اُردو کے یادگار افسانوں میں جگہ حاصل کر لی۔۔۔ جنہیں یادگار بنانے میں اسد محمد خان کی کردار نگاری، فضا سازی اور مکالمہ طرازی کا گہرا دخل ہے۔ 'باسودے کی مریم' کو تو میں اردو کے نعتیہ ادب میں بے مثال اضافہ خیال کرتا ہوں۔ 'ترلوچن' کراچی کی جھگیوں اور کچی آبادیوں کے دکھوں کے تخلیقی مداوے کے لیے ایک مثالی خیال طرازی ہے۔" (۲۷)

رشید امجد کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد کا مؤقف یہ ہے کہ اس نے شعوری طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کے مقاصد کے انہدام پر کہانی کی بنیاد رکھی۔ عصرِ حاضر کے غریب تعلیم یافتہ نوجوان کا کرب، شہر آشوب، گھر کی ویرانی کا ملال انگیز تجربہ، زوالِ مسلسل کا احساس اور علامتوں کی گہرائی اس کی افسانوی کائنات بُنتی ہے۔ وہ داستانوی اسلوب کے برخلاف اسلام آباد (یعنی آج) کی شہری زبان کو برتتا ہے۔ لیکن

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

"بگل والا' منٹو کے عظیم افسانے 'نعرہ' کی معنوی توسیع ہے، وہ تناقضات سے اپنے بیانیے کو طلسم کا ہم پایہ کر دیتا ہے: 'رات نہیں تھی، لیکن رات تھی' ہر شے سیاہی میں چمک رہی تھی۔' (رات، مکالمہ، کراچی۔۱۷۔ص ۸۰)" (۲۸)

علامتی افسانے کی فنی عظمت اپنی جگہ کہ مؤثر ابلاغ اور معنی کا ایک جہان اس میں چھپا ہوتا ہے۔ لیکن ہر کہانی کو زبردستی علامتی اور اس سے بھی کہیں آگے تجریدی بنانے سے بعض دفعہ یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ کہانی کہیں پیچھے رہ جاتی ہے اور نقاد اس میں سے معانی تلاش کرتا رہ جاتا ہے۔ رشید امجد کی کہانیوں میں ابہام کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"انفرادیت کی آرزو میں رشید امجد کچھ عرصہ کے لیے ابہام کے صحرا میں بھی مارا مارا پھرا، یہی وجہ ہے کہ 'ریت پر گرفت' کے بیشتر افسانے نئی تشکیل اور فنی معجزے کی آرزو کے عکاس ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے 'نثری نظم' کی تحریک سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور مکاشفے اور مکالمے کی آرزو سے خالی، کشفِ ذات کا معروف جتن لگتے ہیں۔ تاہم ان افسانوں کی فضا میں رچی افسردگی، شک، خوف اور تنہائی کا ایک خاص پس منظر بھی ہے: 'میں جلا ہوا مکان ہوں اور جلے ہوئے مکانوں کی دیواروں پر اداسیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا'۔ (نارسائی کی مٹھیوں میں، ص۱۶)" (۲۹)

انتظار حسین بھی رشید امجد کو جدیدیت زدہ تجریدی افسانہ نگار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہ جب شمس الرحمٰن فاروقی نے انور سجاد کو جدید افسانے کا معمار اعظم کہہ دیا اور ظفر اقبال کو بھی خوب بڑھایا چڑھایا تو تجریدی افسانہ ایسا چمکا کہ اسلام آباد جا پہنچا۔ اس کے ساتھ وہ اسلام آباد کے تجریدی افسانہ نگاروں میں منشایاد جیسے دھیمے لہجے کے کہانی کار کو بہت سراہتے ہیں۔ کہ جب تجریدی افسانے کی بانسبت

"یہ شکایت شروع ہوئی کہ تجریدی افسانے سے کہانی کہاں غائب ہو گئی، تب کہانی کی ڈھنڈیا پڑی۔ اور تب منشایاد کے افسانوں پر نظر گئی۔ پتا چلا کہ کہانی تو ان افسانوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ گویا یہ افسانے کہانی کی واپسی کی خوشخبری لے کر ابھرے۔ موٹے لفظوں میں یوں کہہ

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

لیجئے کہ رشید امجد کے افسانوں کو دیکھ کر کہانی رفو چکر ہوئی تھی، منشایاد کی انگلی پکڑ کر واپس آئی۔" (۳۰)

لیکن انوار احمد اس نقص کو ارتقاء سے تعبیر کرتے ہیں اور رشید امجد کے بعض افسانوں بالخصوص آخری دور کی بہت سی کہانیوں کو علامت کے سمندر کی ماہر تیراک بتاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رشید امجد کو محفوظ کرتے ہوئے انور سجاد پر چوٹ کر جاتے ہیں:

"رشید امجد کی افسانوی کائنات کا اسم اعظم ریت ہے۔ جولاحاصلی کا مانوس اور بلیغ ستارہ ہے، اسی طرح اس کے ہاں ڈھلوان یا نشیب سے لڑھکنے، زیرِ زمین لیٹنے، گٹر میں سانس لینے اور اپنے نام سے خوفزدہ ہونے کا احساس، جس طرح کے امیجز بناتا ہے انور سجاد کی طرح مبہم نہیں ہوتے۔" (۳۱)

آخر میں ڈاکٹر انوار احمد 'میبل اور میں' والے طریقے کے بجائے دیانتداری سے کام لیتے ہوئے بیگم شائستہ اکرام اللہ، بلقیس عابد علی، آغا سہیل، افتخار جالب، شہزاد منظر اور امجد طفیل جیسے تہتر (۷۳) افسانہ نگاروں سے متعلق بیانیہ قائم کرتے ہیں، کہ جس میں ان کے ایک یا دو مجموعوں کا تعارف یا کچھ افسانوں کا مختصر تجزیہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔ بیشتر افسانہ نگاروں کو ایک، دو یا آدھا صفحہ دیا گیا ہے۔ اس سے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بیانیہ

"اپنی اس کوتاہی کے ازالے کے لئے لکھا گیا کہ ان کی تمام تر کتب خود کو فراہم نہ کر سکا۔" (۳۲)

یوں اردو افسانے کی اس ایک صدی کے بیان میں یہ قابلِ ذکر قلم کار بھی شامل ہو گئے ہیں اور عدم شمولیت کی تشنگی کچھ کم ضرور ہوئی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کا طریقہ کار افسانے کی عام روش سے ذرا ہٹ کے ہے۔ عام طور پر کسی ایک افسانہ نگار کے چند مشہور یا بڑے افسانوں کو لے کر ان کی مختصر کہانی بیان کر دی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ان افسانوں کے کردار، اسلوب، مقصد اور ابلاغ پر بات کی جاتی ہے۔ لیکن یہاں چونکہ ایک ہی کتاب میں دو سو پینتالیس (۲۴۵) افسانہ نگاروں کا ذکر مقصود تھا اور یہ بھی کوشش تھی کہ ان افسانہ نگاروں کی تقریباً تمام قابلِ ذکر کہانیوں پر بات ہو، تو ڈاکٹر انوار احمد نے بہت کم کسی کے ایک یا دو افسانوں پر تفصیلی بات کی ہے۔ ورنہ کسی افسانہ نگار کی مخصوص فکر، واقعہ اور رجحان پر

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

بات کر کے افسانوں کے نام گنا دیئے ہیں یا پھر زیادہ تر ہر افسانے میں سے اپنی بات کی دلیل میں چند سطریں دیتے گئے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد چونکہ محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نگار بھی ہیں، اس لیے افسانے کی تنقید میں ان کی تخلیقی بصیرت کا بھی دخل رہا ہے۔ وہ افسانہ اور افسانہ نگار کو ایک محض نقاد کی روش سے ہٹ کے ایک Fiction Writer (ادیب) کی نظر سے جانچتے ہیں۔ ایک محقق جو شاعر بھی ہو، وہ شاعری کی تحقیق و تدوین اور تنقید میں اس نقاد سے کہیں بہتر ثابت ہو گا جو شاعری کی باریکیوں اور اس کے احساس سے تہی ہو (بشرطیکہ شاعر نقاد غیر جانبدار ہو)۔ اسی طرح ایک ایسا نقاد جب فکشن پر تنقید کرے گا، جو افسانہ نگار بھی ہو، تو اس کی تنقید و تحقیق زیادہ دلچسپ، قارئین اور جویانِ علم کے لیے قابلِ فہم ہو گی۔ مثلاً محمد حسن عسکری، شمس الرحمٰن فاروقی سے ناصر عباس نیر تک کے معروف نقادوں کی ایک فہرست ہے کہ جنہوں اگرچہ تنقید میں نام کیا۔ مگر ساتھ ہی وہ فکشن میں بھی اپنی پوشیدہ صلاحیت کو سامنے لائے (پہلے یا بعد کا معاملہ اور ہے)۔ اسی طرح شاعروں میں غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ سے راشدؔ، میراجیؔ اور فیضؔ تک کے ڈھیروں محقق و نقاد موجود ہیں۔ انتظار حسین کی فکشن پر تنقید ایک محض نقاد سے کہیں زیادہ مؤثر اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد بھی چونکہ ایک افسانہ نگار ہیں اس لیے وہ افسانے کو محض تحقیق و تنقید کے خشک مضمون میں علم بگھارنے کے لیے نہیں پڑھتے، بلکہ یہ ان کے لیے دلچسپی اور تربیت کا سامان ہے۔ جس کو وہ خود سمجھنے اور ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جو افسانے کی پڑھت، فہم اور ڈھنگ سیکھنا چاہتے ہیں۔ اس تحقیق و تنقید میں انوار احمد نے جہاں افسانہ نگاروں کی کہانیوں پر بات کرتے ہوئے ان کا مقام متعین کیا ہے، افسانے کی سو سالہ تاریخ، روّیے، رجحان اور تحریکوں کے تحت بتانے کی کوشش کی ہے وہاں اردو افسانے کی چھان پھٹک (تحقیق و تنقید) کے ذریعے نئے محققین، نقادوں اور افسانہ لکھنے والوں کی تربیت کا سامان بھی کیا ہے۔ اس لیے اردو افسانے کی تحقیق و تنقید میں ان کا کام وقیع اور باقی رہنے والا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مسرت بانو، ڈاکٹر۔ ڈاکٹر انوار احمد: شخصیت اور فن۔ سرگودھا: شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱ تا ۳۱

۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء، ص ۱۷، ۱۸

۳۔ انتظار حسین۔ علامتوں کا زوال۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۱

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر۔ افسانہ اور افسانہ نگار۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۲۷

۵۔ سہ ماہی۔ روشنائی: افسانہ صدی نمبر۔ کراچی: نشری دائرہ پاکستان، جلد ۷، شمارہ ۲۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۹

۶۔ صفات احمد علوی، ڈاکٹر۔ افسانہ؟ (مضمون)۔ کراچی: مشمولہ: سہ ماہی "روشنائی"، افسانہ صدی نمبر، شمارہ ۲۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۵

۷۔ وزیر آغا۔ افسانے کا فن (مضمون)۔ لاہور: مشمولہ: گوپی چند نارنگ، "اردو افسانہ: روایت اور مسائل"، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۲

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ افسانے کی حمایت میں۔ کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۵

۹۔ راجندر سنگھ بیدی۔ افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل۔ مشمولہ: گوپی چند نارنگ، "اردو افسانہ: روایت اور مسائل"، ص ۲۱

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اُردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ص ۱۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۳۔ راشد الخیری۔ نصیر اور خدیجہ۔ کراچی: مشمولہ: سہ ماہی "روشنائی"، افسانہ صدی نمبر، ص ۱۷۹، ۱۸۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ص ۶۲

۱۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ افسانے کی حمایت میں۔ ص ۱۵

۱۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ص ۱۴۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۱۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر۔ اُردو افسانہ۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۴۲

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

۲۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ص۲۶۱

۲۱۔ ایضاً، ص۲۹۲

۲۲۔ ایضاً، ص۳۴۶

۲۳۔ سعادت حسن منٹو۔ کلیاتِ منٹو (جلد دوم، افسانے)۔ اسلام آباد: مرتب: امجد طفیل، Narratives، ۲۰۱۲ء، ص۳۵۶

۲۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ص۳۶۰

۲۵۔ ایضاً، ص۳۹۸

۲۶۔ ایضاً، ص۴۴۶، ۴۴۷

۲۷۔ ایضاً، ص۵۷۸

۲۸۔ ایضاً، ص۵۹۳

۲۹۔ ایضاً، ص۵۹۲

۳۰۔ انتظار حسین۔ اپنی دانست میں۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص۱۱۲

۳۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ۔ ص۵۹۳

۳۲۔ ایضاً، ص۱۷